ڈاکٹر فرمان فتح پوری
(ستارۂ امتیاز)

اُردو کا موجودہ رنگ روپ

زبان، انسان کی سماجی و معاشرتی ضرورتوں کی ایجاد ہے، اور سماجی و معاشرتی زندگی ہی کے سہارے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی ہے اور اُسی کے زیر اثر اس کی صورت و معنی میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اس لیے کسی زبان کے عروج و زوال کی داستان حقیقت میں قومی ترقی و تنزل کی تاریخ ہوتی ہے، وجہ یہ ہے کہ زبان بھی اپنے بولنے والوں کی طرح اپنے سماجی محرکات و عوامل کی پابند ہوتی ہے اور اپنے ماحول یا اپنی سوسائٹی سے رشتہ توڑ کر زیادہ دنوں تک نہ تو زندہ رہ سکتی ہے اور نہ آگے قدم بڑھا سکتی ہے چنانچہ دنیا کی بڑی سے بڑی زبان بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ دُنیا کی دوسری زبانوں کے اثرات یا الفاظ سے خالی ہے۔ اُردو زبان بھی اسی قانونِ فطرت اور اُصولِ جمہوری کی پابند ہے بلکہ دوسری زبانوں کی بہ نسبت زیادہ پابند ہے۔

اُردو نے اپنے آس پاس کی زبانوں مثلاً سندھی، بلوچی، سرائیکی، پنجابی، پشتو، ہندی وغیرہ کے علاوہ عربی، فارسی، انگریزی اور دُوسری بیرونی زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ بے شمار الفاظ لیے ہیں اور تلفظ و معنی میں حسب ضرورت تبدیلی کے ساتھ لیے ہیں۔ اُردو زبان پر کسی طبقے یا علاقے کی اجارہ داری کبھی نہیں رہی وہ آزادانہ اپنے معاشرے کے ساتھ آگے بڑھی ہے اور سماجی ضرورتوں کے مطابق مختلف علاقوں میں مختلف اسالیب اور لب و

لہجے میں ڈھلتی گئی ہے۔ اسلوب اور لہجے کی یہ تبدیلی دُنیا کی ہر زبان میں نظر آئے گی۔ یہ خیال کرنا کہ انگریزی زبان، انگلینڈ اور یورپ کے مختلف علاقوں میں ایک ہی لہجے (ACCENT) میں بولی جاتی ہے صحیح نہیں ہے، ہر علاقے کے لوگ اسے اپنے اپنے انداز میں بولتے ہیں اور یہی تقاضائے فطرت ہے۔

یہی حال اُردو کا ہے، لکھنو، دہلی، حیدرآباد اور لاہور وغیرہ اُردو کے قدیم علمی و ادبی حلقے ہیں اور ان علاقوں میں اُردو کے سلسلے میں جو کام ہوا ہے وہ یکساں طور پر مستند و معیاری ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں سے کسی جگہ کی زبان معیار سے گری ہوئی ہے۔ بایں ہمہ ان مقامات کے لہجوں میں خاصا فرق نظر آتا ہے، یہ لہجے دراصل جغرافیائی ماحول اور تمدنی زندگی کی تابع ہوتے ہیں اور ان سے بچ کر نکلنا آسان نہیں ہوتا اس لئے کسی خاص علاقے کے لوگوں کا کسی دوسرے علاقے کے لوگوں کے لب و لہجہ پر ہنسنا یا اسے اپنے لہجے سے گھٹیا خیال کرنا، زبان اور اس کے مزاج سے ناواقفیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہم یوپی اور دہلی والے خاص طور پر اپنے لہجوں پر کبھی کبھی ناز کرتے ہیں اور دوسروں کے لہجوں پر اپنے لہجے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ ماحول کے فطری تقاضوں کے مطابق خود ہمارا لب و لہجہ کس طرح بدل رہا ہے۔ پہلے ثقہ حضرات فعل حال تمام کے جملے اس طور پر استعمال کرتے تھے۔

(۱) میں نے ان سے کہہ دیا ہے۔

(۲) حامد نے اپنے دوست کو خط لکھ دیا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ یہ جملے درست ہیں اور آج بھی بولے اور لکھے جاتے ہیں لیکن اب ان جملوں کو یوں بھی بولا جاتا ہے کہ

(۱) میں نے ان سے کہا ہوا ہے۔

(۲) حامد نے اپنے دوست کو خط لکھا ہوا ہے۔

ان فقروں کو سن کر کوئی کتنا ہی ناک بھوں کیوں نہ چڑھائے لیکن یہ مقبول ہو رہے

ہیں اور ان حلقوں میں بھی بولے اور سنے جاتے ہیں جو خاص یوپی اور دہلی سے تعلق رکھتے ہیں، یہ اثر کس کا ہے؟ اس سے بحث نہیں ہے، سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ زبان اور اس کے لہجے میں عہد بہ عہد اور مقام بمقام تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، یہی تبدیلیاں جب قبول عام حاصل کر لیتی ہیں تو معیاری زبان کا جزو بن جاتی ہیں۔ اُردو کے بدلتے ہوئے رنگ روپ کے سلسلے میں چند لفظوں کے استعمال کا ایک اور اسلوب دیکھیئے، عام و خاص سبھی بولتے اور لکھتے ہیں۔

(۱) یہ میرا اپنا گھر ہے۔

(۲) وہ تمہارا اپنا معاملہ ہے۔

خاص علاقوں کے ثقہ حضرات نے ''میرا اپنا'' اور ''تمہارا اپنا'' کے ٹکڑوں پر بھی اعتراض کیا۔ جواب صرف یہ تھا کہ فلاں فلاں علاقے کے لوگ اس طرح نہیں بولتے لیکن کسی کی ایک نہ چلی، اب یہ اسلوب عام ہے اور علماء و فصحا سبھی لکھتے اور بولتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ اسلوب مدتوں سے چلا آ رہا تھا۔

یہ محض معترضین کی بے خبری تھی جو اس اسلوب گفتگو کو غلط سمجھتے تھے۔ چند الفاظ کا استعمال اور دیکھیئے۔

(۱) اس نے آج بہت بور کیا۔

(۲) حامد کی تقریر نے جلسے میں بے سبب بوریت پیدا کر دی۔

(۳) آیا بڑا دلاّ کہیں کا۔

(۴) محمود آج کل محلے کا دادا گیر بنا گھومتا ہے۔

(۵) میں آپ کی دادا گیری نکال دوں گا۔

(۶) اس نے خوامخواہ پھڈا کھڑا کر دیا ہے۔

(۷) ایک روپے کا کھلا چاہیئے۔

(۸) اسی جگہ محمود کے بازو میں حامد کی بھی دوکان ہے۔

(۹) اس نے ایک جھوٹا بیان داغ دیا تو کیا ہوا سیاست میں سب چلتا ہے۔

(۱۰) اس کا بڑا لڑکا تو بالکل لوفر ہے۔

(۱۱) کاغذ کے بیوپاری نے کہا مال خلاص ہے۔

ان جملوں میں بور، بوریت، دلا، دادا گیر، دادا گیری، پھڈا، کھلا، بازو، چلتا ہے، لوفر اور خلاص، ایسے الفاظ ہیں جو آئے دن سنے اور بولے جاتے ہیں، اب محض اس بنا پر کہ یہ اُردو میں پہلے سے موجود نہ تھے یا فلاں شہر و فلاں علاقے میں استعمال نہ ہوتے تھے۔ کون ہے جو انہیں متروک و مردود قرار دے گا، ان الفاظ نے پوری طرح جڑ پکڑ لی ہے اور اب انہیں عام و خاص دونوں استعمال کرتے ہیں۔

نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ بعض پرانے الفاظ بھی نئے معنوں کے ساتھ اردو میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذیل کے جملوں کو دیکھئے:۔

(۱) جلد بازی کی ضرورت نہیں تسلی سے کام کرو۔

(۲) آرام آرام سے چلو ورنہ ٹھوکر کھا کر گرو گے۔

(۳) اس کپڑے کا رنگ بہت گاڑھا ہے۔

(۴) میری اس کی بڑی دوستی ہے۔

(۵) میرا دوست آج کل ملتان میں کمشنر لگا ہوا ہے۔

(۶) آپ نے بہت کم کھایا کوئی چیز اور لیجئے۔

(۷) آپ کے بھائی کتنی تنخواہ لیتے ہیں۔

(۸) محمود صاحب آپ کو ساتھ والے کمرے میں مل جائیں گے۔

(۹) میں اگلے ہفتے حیدرآباد گیا تھا۔

ان جملوں میں ''تسلی، آرام، گاڑھا، بڑی، کمشنر لگا ہوا ہے''، ''کوئی چیز اور لیجئے، تنخواہ لیتے ہیں، ساتھ والے کمرے اور اگلے ہفتے'' کے الفاظ و فقرات پر غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ یہ اپنے معنی کس طرح بدل رہے ہیں۔ تسلی اور آرام، آہستہ آہستہ کے معنی میں

استعمال ہوئے ہیں۔ ''گاڑھا'' سے مراد ''گہرا'' اور ''بڑی'' سے مراد گہری ہے۔ پانچویں اور چھٹویں جملوں کے خط کشیدہ ٹکڑے علی الترتیب، انگریزی الفاظ (Posted اور Take more) کے اُردو ترجمے ہیں۔ تنخواہ لینا، تنخواہ پانے کے مترادف ہے اور ''اگلے'' بمعنی پچھلے آیا ہے۔

اس طرح کے نہ جانے کتنے الفاظ و فقرات اور محاورات و اسالیب ہیں جو مقامی زندگی کے زیر اثر، اردو میں داخل ہو کر اسے بالکل نیا رنگ روپ دے رہے ہیں۔ کوئی کتنی ہی مخالفت اور کتنی ہی شعوری کوشش کیوں نہ کرے، یہ رنگ روپ پوری طرح اُبھر کر سامنے آئے گا اور یہی پاکستانی اُردو کا مستقل رنگ روپ ہوگا۔ ایسا ہونا بالکل فطری اور معاشرتی زندگی کے تقاضوں کے عین مطابق ہے اور اگر اُردو کو زندہ رکھنا ہے اور اگر آگے بڑھنے کا موقع دینا ہے تو ہمیں خندہ پیشانی کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہیئے۔ زبان پر کسی کی اجارہ داری نہیں رہی اور اگر کبھی رہی ہے تو اس کا دور بھی دوسری اجارہ داریوں کے ساتھ ساتھ ختم ہوگیا، اُردو ایک بین الاقوامی اور بین الطبقاتی مزاج کی زبان ہے۔ ابتدا میں اس نے عربی، فارسی اور ہندی سے بہت کچھ لیا ہے۔ برطانوی عہد میں اس نے انگریزی زبان کا گہرا اثر قبول کیا ہے اور اب جمہوری دور میں وہ سب سے زیادہ اثر جمہور کا قبول کر رہی ہے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی کے قول کے مطابق:

> ''ایک زبان کے بولنے والوں کو ایک ایسی جمہوری حکومت تصور کرو جسے رائے عامہ، انتظام کا اختیار عطا کرتی ہے اور یہ اختیار ہمیشہ نگرانی اور احتساب کے ماتحت ہوتے جاتے ہیں، ہر فرد مجاز ہوتا ہے کہ مشترکہ زبان میں اضافہ کرے، یعنی نئے لفظ اختراع کرے، اگر ان کی ضرورت ہو، اور وہ اختراع جماعت کے مذاق اور زبان کے مزاج کے تقاضے کے ناموافق نہ ہو۔''

یونانی مفکر افلاطون کا بھی یہی خیال تھا۔ اس کے نزدیک عام لوگ ہی زبان کے

معاملے میں حاکم اعلیٰ ہیں اور اس سلسلے میں کسی دوسرے کو میر فیصل نہیں بنایا جا سکتا، واقعہ بھی یہی ہے روزمرہ کے الفاظ زیادہ تر عوام ہی کی تخلیق کردہ ہوتے ہیں، پھٹ پھٹیا، ہوائی جہاز اور تار گھر وغیرہ کے الفاظ بطور خاص بنائے نہیں گئے بلکہ عوام نے اپنے طور پر بولنا شروع کیا اور وہ کثرت استعمال سے مستند قرار پا گئے، زبان کی ریاست میں یہی قانون مروج رہا ہے اور یہی آئندہ بھی رائج رہے گا۔

☆☆☆